

حوصلہ شرط وفائہنرا

میں دیکھ کر عارفہ، حاجرہ کے گھر والوں کو ہفتے کی شام چائے پر مدعو کر لیتی ہیں۔ مرحا اپنی ماما اور ممانی کو پاپا کی دوسری شادی کے بارے میں بتاتی ہے کہ اس کی اپنی دونوں بہنیں بھی راضی ہیں مگر وہ خود اس کے لیے راضی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ آسیہ بی کو تسلی دیتی ہے کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی جس سے انہیں تکلیف پہنچے۔ مرحا، عارفہ سے اپنے پاپا کی شادی کے متعلق بات کرتی ہے تو وہ کہتا ہے طلاق کے بعد رجوع میں بہت مسائل ہو جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ میری کم سے شادی کے بعد آئی کو خاندان میں ایک حیثیت مل جائے گی تو مرحا اسے اجازت دیتی ہے کہ وہ عارفہ پھوپھو سے اپنی اور اس کی شادی کی بات کر لے۔ ازنا، عریشان سے ملنے جاتی ہے۔ حاجرہ کے گھر والے بدرالدین کا گھر دیکھ کر بہت مطمئن اور خوش ہوتے ہیں۔ مرحا سوچتی ہے کہ ایک بار حاجرہ سے مل کر دیکھتی ہوں کیا خبر وہ میرے سمجھانے پر شادی کا ارادہ ترک کر دیں۔ ازنا، عریشان کا دیا ہوا بریسلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہے۔ گھر میں عاتکہ پھوپھو اور عارفہ پھوپھو، پاپا کے امام ضامن باندھتی ہیں۔ ماموں، آسیہ بی کو سمجھاتے ہیں کہ وہ پچھتانے کے بجائے حالات سے سمجھو تا کریں۔ ادھر دادی، حاجرہ کے امام ضامن باندھتی ہیں۔ مرحا، حاجرہ کے آفس کال کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ شادی کی چھٹیوں پر ہے۔ عریشان، مرحا کو سمجھاتا ہے کہ شادی کرنا اس کے پاپا کا شرعی حق ہے اور اگر وہ ایک بیٹی کے طور پر اپنی ماں کے لیے سوچ رہی ہے تو پاپا کے لیے بھی سوچے۔ آسیہ بی، بدرالدین کو تنگ کرتی ہیں تو وہ بڑھ کر الجھ جاتے ہیں۔ عارفہ اپنی ماں سے مرحا کے لیے بات کرتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہیں کہ انہوں نے زونا کشہ سے اس کی منگنی طے کر دی ہے۔ عارفہ اصرار کرتا ہے کہ مرحا بھی تو ماموں کی بی بیٹی ہے، وہ آسیہ بی کے پاس اس کا رشتہ لے کر جائیں۔ بدرالدین، حاجرہ سے فون پر بات کرتے ہیں اور حاجرہ کے خیالات جان کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مرحا، عارفہ کو فون کرتی ہے تو وہ فون پک نہیں کرتا۔ آفس کے نمبر پر فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ دس دن کی چھٹی پر ہے۔ یہ سن کر مرحا پریشان ہوتی ہے۔ عریشان، ازنا کو بتاتا ہے کہ وہ حسنه خالہ کے گھر گیا تو اس کی مرحا سے بات ہوئی اور اس نے اسے سمجھایا ہے تو ازنا، عریشان پر شک کرتی ہے۔ حسنه، آسیہ سے کہتی ہیں کہ بدرالدین کی شادی رکوانے کے لیے اسی عاملہ کے پاس جائیں اور وہ خود ان کے ساتھ عاملہ کے پاس جاتی ہیں۔ عارفہ اپنے فون سے عارفہ کے نمبر پر کال کرتی ہیں تو کال انٹینڈ نہیں ہوتی پھر وہ آفس فون کرتی ہیں تو عارفہ کی چھٹی کا پتا چلتا ہے۔ بالآخر وہ عاتکہ اور ان کے شوہر فیصل کو اپنے گھر بلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کی سمجھ نہیں آ رہا کہ کس طرح بدرالدین کو عارفہ کے بارے میں بتائیں۔ بدرالدین کا فون آتا ہے تو عاتکہ، عارفہ بہن کے بیمار ہونے کا بتاتی ہیں۔ ازنا کی خفگی کے بعد عریشان دوران ڈیوٹی بھی ٹھیک کام نہیں کر پاتا تھا تو فیجرا سے جاب سے نکال دیتے ہیں۔ عریشان وہاں سے نکل ہی رہا ہوتا ہے کہ کوئی اسے پیچھے سے پکارتا ہے اور وہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ عاتکہ کے مشورے پر عارفہ، بدرالدین کو بتاتی ہیں کہ عارفہ اپنے کسی دوست کے والد کی طبیعت کی وجہ سے پشاور میں ہے اس لیے منگنی کی تقریب ملتوی کرنی پڑے گی۔ فیصل (عاتکہ کے شوہر)، عارفہ کا پتا کرنے مرحا کے ماموں کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ عارفہ واپس آ جاتا ہے اور عارفہ بیٹے کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتیں۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 10

”تم کہاں چلے گئے تھے میرے لعل! اتنا بھی نہیں سوچا کہ میرے بغیر میری ماں پر کیا گزرے گی؟“ عارفہ بار بار اپنے بیٹے کا منہ اور ماتھا چوم رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح عارفہ کو اپنے کلیجے میں چھپالیں۔

”امی! مجھے اب مزید شرمندہ مت کریں بلکہ اس سارے قصے کو میری نادانی سمجھ کر بھول جائیں اور مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں امی کہ آپ جیسا چاہیں گی، ویسا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ میں نہیں کروں گا مرحا سے شادی۔۔۔ بلکہ آج کے بعد آپ کبھی میری زبان سے اس کا نام تک نہیں سنیں گی۔ مگر آج آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ بھی میرے سر پر سہرا سجانے کا خواب کبھی نہیں دیکھیں گی اور نہ کسی لڑکی سے میری شادی کی بات آگے بڑھائیں گی۔ میں بس آپ کے ساتھ رہوں گا امی! آپ کی خدمت کروں گا اسی میں میری خوشی، میری راحت اور جنت ہے۔“ عارفہ نے ماں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے ان کے پیروں کو چھوا۔

”یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے میرے بچے۔۔۔۔۔! ماں کے دل کی خوشی تو اس کی اولاد کی خوشی میں ہی ہوا کرتی

ہے۔ میں خود کراؤں گی تیری شادی..... وہ بھی تیری پسند سے یعنی مرزا کے ہی ساتھ۔“ عارفہ بیگم کا دل اپنے بیٹے کی اس قدر فرمانبرداری اور سعادت مندی سے پھل کر رہ گیا تھا اور انہوں نے فوراً ہی اس کی محبت کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”تو فکر مت کر میرے لعل! میں خود بدرالدین سے مرزا کے لیے بات کروں گی، بدرالدین کے لیے بھلا کیا فرق پڑتا ہے زونا نشہ نہ سہی مرزا سہی..... آخر ہیں تو دونوں انہی کی بیٹیاں..... بس بدر کی دوسری شادی کا مرحلہ خیر و عافیت سے نمٹ جائے تو پھر میں یہ بات چھیڑوں گی..... مجھے معلوم ہے کہ زونی ہمارے اس فیصلے سے بہت دلبرداشتہ ہوگی مگر مجھے امید ہے کہ حاجرہ اسے ایک اچھی ماں اور ایک اچھی دوست کی طرح سنبھال لے گی۔“

”نہیں امی..... نہیں! آپ کو خود پر جبر کر کے یہ فیصلہ میری خوشی کی خاطر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں آج ہی مرزا کو کال کر کے صاف الفاظ میں بتا دوں گا کہ میں اسے نہیں اپنا سکتا لہذا وہ میرے انتظار میں نہ رہے۔“

عارفہ ماں کے پاس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے بولا۔

”ایسی باتیں کر کے مجھے آزدہ مت کرو بیٹا..... اب یہ سب کچھ میں اپنی خوشی سے کروں گی.....“ عارفہ بیگم نے کہا تو عارفہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ سب آپ دل سے کہہ رہی ہیں ناں امی.....؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، بالکل یہ سب میں پوری سچائی اور دل کی خوشی سے کہہ رہی ہوں.....“ عارفہ بیگم نے پیار بھری نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس ایک وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے.....“ انہوں نے کہا تو عارفہ نے پیار سے انہیں گلے لگا لیا۔

”ہرگز نہیں، میں اب کبھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا..... چاہے آپ میری شادی مرزا سے کریں یا نہ کریں مگر میں کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گا، یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔“ عارفہ نے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے دبا کر وعدہ کیا تو عارفہ بیگم بیٹے کی بلا میں لینے لگیں۔

”خالہ آپ کیسی ہیں، آپ کے گھر میں سب خیریت ہے؟“ عارفہ نے ساتھ بیٹھی عاتکہ خالہ سے پوچھا۔

”سب خیریت ہے بیٹا مگر تم بہت زیادہ تھکے ہوئے لگ رہے ہو، اس لیے نہادھو کر فریش ہو جاؤ پھر سکون سے باتیں کریں گے۔ میں اتنی دیر میں ٹیبل پر کھانا لگواتی ہوں.....“ عاتکہ کے کہنے پر عارفہ جی اچھا کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

عارفہ بیگم نے دیکھا کہ پچھلے دو چار روز میں ہی عارفہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم سی تھیں اور ان کے نیچے گہرے حلقے آگئے تھے۔ شیو بڑھی ہوئی اور کپڑے میلے تھے۔ انہیں افسوس ہونے لگا، خواہ مخواہ انہوں نے بچے کے ساتھ ضد باندھ لی تھی، کیا ہو گیا تھا اگر وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے کا کہہ رہا تھا، اس میں اتنا اشو بنانے کی کیا ضرورت تھی بھلا..... اگر وہ عارفہ کی خوشی کا خیال کر لیتیں تو اتنے دن انہیں بیٹے سے دوری کی اذیت تو نہ اٹھانی پڑتی اور نہ وہ پریشان ہوتا..... خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اللہ کا لاکھ شکر کہ ابھی اتنی دیر تو نہیں ہوئی کہ کل کلاں کو خدا نخواستہ پچھتانا پڑ جاتا۔ اگر عارفہ جذبات میں آکر خود کو کچھ نقصان پہنچا لیتا تو وہ کیا کرتیں.....! اپنے اس فیصلے کے بعد اب عارفہ کافی پرسکون اور مطمئن سی ہو گئی تھیں۔

بعد میں عارفہ نے بتایا کہ وہ ان سے ناراض ہو کر اپنے ایک دوست کے پاس دو رافتاہ گاؤں چلا گیا تھا۔ جہاں دوست نے اپنی روایتی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں آنے دی تھی، اجنبی اور نامحرم لوگوں کو گھر میں نہیں ٹھہرایا جاتا تھا اور اسے معیوب سمجھا جاتا تھا، اس لیے اس کے دوست نے عارفہ کو مسجد سے متصل مہمان خانے میں ٹھہرایا

تھا، جہاں مسافر بھی آکر ٹھہرتے تھے۔ مگر تین وقت کا کھانا اور چائے عارف کے لیے اس کے دوست کے گھر سے ہی بن کر آتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ رات کو وہ خود ایک بڑے پیالے میں گرم دودھ بھی اس کے پینے کے لیے لے آتا تھا۔ مسجد کے ساتھ ہونے کی وجہ سے عارف نے بیچ وقت نماز شروع کر دی تھی۔ قرآن کا ترجمہ اور تفسیر کا اس نے پہلی بار اتنی تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ اور احادیث کو بغور سمجھا اور پڑھا تھا۔ ان سب کے مطالعے کے بعد اسے بس یہی ایک بات سمجھ آئی تھی کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بعد انسان کے لیے ماں، باپ کی محبت اور ان کی خدمت اور اطاعت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں..... ویسے بھی عارف کو ماں کی یاد بہت شدت سے آنے لگی تھی، اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کے لیے بہت روتی ہوں گی اور پریشان ہوں گی۔ اس علاقے میں موبائل کے سکنز کا کافی مسئلہ تھا۔ اس نے مرحا سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ مگر ماں کی محبت ہر چیز پر غالب تھی۔ ادھر اس کا دوست بھی عارف کو یہی سمجھا تا رہا کہ اگر اپنی والدہ کے حکم پر ایک لڑکی کی محبت کو قربان بھی کر دیا جائے تو یہ اتنے گھائے کا سودا نہیں..... دن رات کی سوچوں نے عارف کو بیمار ڈال دیا تھا۔ ذرا سنبھلا تو فوراً گھر کی راہ لی تھی۔ عارف کے واپس آ جانے پر عارفہ بیگم نے شکرانے کے نوافل ادا کیے تھے۔

☆☆☆

منگنی ملتوی ہونے پر زونا نشہ بہت ڈسٹرب تھی۔ مگر خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایسے میں ازنانے اسے بہت ڈھارس دی اور ہمت بندھائی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ماں کے بعد بہنیں ہی ایک دوسرے کا سہارا ہوا کرتی ہیں۔ زونا نشہ کو اب اندازہ ہوا تھا۔ ازنانے سمجھانے پر کہ اسے اللہ کے حضور دعا کرنی چاہیے تو وہ سب کچھ بھول کر دل سے دعا مانگتی کہ یا اللہ عارف کے دوست کے والد کو صحتیاب فرما دے اور عارف بھی خیر و عافیت سے اپنے گھر لوٹ آئیں۔ شاید یہ زونا نشہ کی دعاؤں کا بھی اثر تھا کہ عارف دو چار دن کے بعد خیر و عافیت سے اپنے گھر واپس لوٹ آیا تھا۔

☆☆☆

عارفہ بی کے اس فیصلے کے بعد کہ اب مرحا ہی ان کی بہو بنے گی، عارف کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور وہ مرحا کو جلد از جلد یہ خبر سنانا چاہتا تھا اور اس کے سنگ مل کر مستقبل کے خوابوں میں رنگ بھرتا چاہتا تھا۔ اب تو کافی دنوں سے عارف کا مرحا سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جبکہ عارف کے موبائل پر مرحا کی کئی کالز آئی ہوئی تھیں مگر اس نے ابھی تک کال بیک نہیں کی تھی۔ عارف کو معلوم تھا کہ مرحا اس سے سخت ناراض ہوگی کہ اتنے دن سے رابطہ کیوں نہیں کیا مگر اس کے پاس جواب موجود تھا کہ وہ ایک امیر جنسی میں اپنے دوست کے گاؤں ایک پہاڑی علاقے میں گیا ہوا تھا جہاں موبائل سکنز نہیں آتے تھے۔ عارف، مرحا کو یہ بات ہرگز بتانا نہیں چاہتا تھا کہ مرحا کی وجہ سے عارف اور اس کی امی کے درمیان کوئی بحث ہوئی تھی اور عارف ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا تھا۔ اسی لیے ہر موقع سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

”اچھا جی یاد آگئی آپ کو ہماری.....!“ حسب توقع مرحا نے فون اٹھاتے ہی سلام کے بعد پہلا سوال یہی کیا تھا۔

”اوہوں..... بالکل سچی نہیں.....“ عارف کا لہجہ حسب سابق کافی شوخ تھا۔

”اچھا جناب تو پھر کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ اتنے دنوں کے ناغے کے بعد آج آپ نے فون کیسے کر لیا؟“ مرحا

نے جلدی سے سوال کیا تھا۔

”صرف یہ بتانے کے لیے یاد تو انہیں کیا جاتا ہے پکی جنہیں انسان بھول جائے، تم تو ایک بل کے لیے بھی

دل سے محو نہیں ہوئیں تو یاد کرنے کا کیا سوال؟“ عارف نے پیار بھرے لہجے میں خوشی سموتے ہوئے کہا تو مرحا خاموش رہ گئی۔

”کہاں غائب رہے اتنے دنوں تک.....؟“ مرحانے خفگی سے سوال کیا..... جواباً عارف نے پہلے سے رٹا رٹایا جواب دہرایا۔

”اچھا، چلیں ٹھیک ہے، آپ کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے آپ کو معاف کیا۔ مگر آئندہ پھر کبھی بتائے بنا اس طرح غائب مت ہو جائیے گا۔ ورنہ ہم دنیا کی اس بھیڑ میں اگر ایک بار کھو گئے تو پھر کبھی نہیں ملیں گے آپ کو.....“ مرحانے کہا تو عارف بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔

”اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو.....“ عارف نے بے تابی سے کہا۔ ”میں تو تمہیں ایک بہت بڑی خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔“

”وہ کیا.....؟“ مرحانے تجسس سے پوچھا۔

”میری امی یعنی تمہاری عارف پھوپھو میرے تمہارے رشتے کی بات کرنے عنقریب ماموں جان کے ہاں جائیں گی.....“ عارف نے ایک، ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں خبر سنائی تھی۔

”رہیل.....“ مرحانے کی آواز جوش سے قدرے بلند ہو گئی تھی۔

”مگر وہ پاپا کے گھر میرے رشتے کے لیے کیوں جائیں گی..... میں تو یہاں رہتی ہوں اپنی ماما کے ساتھ تو پھوپھو کو تو یہاں آنا چاہیے۔“ مرحانے کی بات پر عارف سوچ میں پڑ گیا۔

”وہ پہلے ماموں جان کے پاس جائیں گی اور اس کے بعد آسیہ آنٹی کے پاس مدعا لے کر آئیں گی۔“

”اچھا..... یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔“ مرحانے خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”بس تم اس خاص موقع کے لیے نیا سوٹ سلواؤ.....“ عارف نے شرارت سے کہا۔

”ماشاء اللہ..... کافی سوٹ ہیں میرے پاس کچھ بھی پہن لوں گی، میں کون سا پہلی بار ملوں گی پھوپھو سے۔ بس میں جیسی بھی ہوں، پھوپھو جانتی ہیں مجھے۔“ مرحانے سادگی سے کہا۔

عارف ہنس دیا۔

”ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے، سوٹ کا تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ تم لڑکیوں کو نت نئے سوٹ لینے کا شوق جو ہوتا ہے، بس ذرا کوئی بہانہ بنا نہیں اور نیا سوٹ آیا نہیں.....“

”جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں تو بغیر بہانے کے بھی نئے سوٹ لیتی رہتی ہوں.....“ مرحانے ہنس کر جواب دیا تو عارف بھی ہنس دیا۔

”تم نہیں آرہی ہو ماموں کی شادی کی تقریب میں.....؟“ عارف نے پوچھا۔

”نہیں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے اپنے فادر کی نئی نویلی دلہن دیکھنے کا۔“ مرحانے لہجے میں تلخی تھی۔

”ہوں.....“ عارف نے کچھ سوچتے ہوئے ہنکارا۔

”زندگی کے حقائق خواہ کتنے ہی تلخ ہوں مگر ہمیں انہیں قبول کرنا ہی پڑتا ہے مرحانہ! اپنا دل بڑا کرو اور زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو خوش دلی سے قبول کرنا سیکھو.....“ عارف نے اسے سمجھایا۔

”آپ کے سنہری مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی.....“ مرحانے کہا اور دھیرے سے ہنس دی تھی۔

عارف سمجھ گیا تھا کہ اسے اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی مگر وہ اس کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتی تھی اس لیے ہنس کر ٹال گئی تھی۔

”اچھا اپنی فوراً سے ایک سیلفی لے کر بھیجو..... اتنے دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے، بہت دل کر رہا ہے دیکھنے کو.....“ عارف نے محبت بھرے لہجے میں فرمائش کی۔

”اوں ہوں..... کوئی سیلفی نہیں، دیکھنا ہے تو یہاں تشریف لے آئیے۔“ مرحانے کہا تو وہ سرد آہ بھر کے رہ گیا۔
 ”اتنی چھوٹی سی آرزو بھی پوری نہیں ہو سکتی اب ہماری.....“
 ”سمجھا کیجیے ناں.....! میں نے آج بالوں میں کنڈیشنگ کے لیے دی، انڈا، کافی اور ایلو ویرا جیل لگا رکھا ہے، اس وقت بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی.....“ مرحانے سچائی بتادی۔

”کیا..... اتنا کچھ لگایا ہے بالوں میں، اپنے بالوں پر کچھ رحم کرو یا..... اگر سارے جھڑ گئے تو کیا کروگی.....؟ ویسے اللہ ہی حافظ ہے تم لڑکیوں کا بھی۔“ عارف نے کہا تو اس کے ساتھ مرحا بھی ہنس دی..... اور پھر ہنستے، ہنستے مرحا ایک دم خاموش ہو گئی تھی۔

”شاید کوئی آرہا ہے..... اچھا میں فون رکھتی ہوں.....“ مرحانے کہا اور ساتھ ہی کال کاٹ دی۔
 عارف چند لمحے اپنے موبائل کی اسکرین دیکھتا رہا اور پھر سرد آہ بھر کر موبائل سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

☆☆☆

مرحا کی فیصل پھوپا کے آنے کی اطلاع پر آسیہ بی نے فوراً ملازمہ کو گیٹ پر بھیج کر فیصل میاں کو اندر بلوایا اور خود دونوں ہاتھوں سے اپنے بکھرے بال سنوارنے لگیں۔

”ادھر لاؤنج میں ہی لے آؤ، فیصل بھائی کوئی غیر نہیں ہیں کہ جوڈرائنگ روم میں اجنبیوں کی طرح بیٹھیں۔“
 ممانی نے ملازمہ کو فیصل کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھتے دیکھ کر پکار کر کہا تھا۔ فیصل نے چونک کر ممانی کی طرف دیکھا اور ”شکریہ حسنہ بہن“ کہہ کر لاؤنج کی طرف ہی بڑھ آئے تھے۔

سلام دعا اور خال احوال پوچھنے کے بعد آسیہ بی نظریں جھکائے یوں چپ بیٹھی تھیں کہ جیسے فیصل کی جانب سے بات چیت کے آغاز کی منتظر ہوں۔
 حسنہ ممانی چائے پانی کے انتظام کے بہانے کچن میں کھسک آئی تھیں جبکہ مرحا، پھوپا سے ملے بغیر ہی مٹی اور گڈ کو سنبھالنے کے بہانے اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

فیصل میاں نے اپنی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں چاروں طرف گھمائیں اور پھر تیز چمکدار نظریں آسیہ پر گاڑ دیں۔ وہ تو سمجھے کہ طلاق کے بعد آسیہ بی پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ بڑا ہوگا اور ان کا حسن گہنا گیا ہوگا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ آسیہ بی کی خوب صورتی تو طلاق کے بعد کچھ اور بھی نکھر آئی تھی۔ گالوں پر زردیاں کھنڈنے سے بجائے گلابیاں بکھری تھیں اور ان کی رنگت آج بھی ویسی ہی تھی کہ جیسے کسی نے دودھ میں زعفران کے ساتھ گلابی رنگ گھول کر شامل کر دیا ہو۔ بڑی، بڑی غلابی آنکھوں پر سیاہ کھنی اور لمبی پلکوں کی جھار ویسے ہی تھی۔ اگر یہ افسردگی اور سوگوار کا عالم تھا تو اس سوگوار نے تو ان کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیے تھے۔

آسیہ بی شاید ابھی نہا کر نکلی تھیں۔ جبھی ان کے بال ابھی تک گیلے تھے، شاید انہیں بال خشک کرنے کا ٹائم نہیں ملا تھا۔ اگرچہ آسیہ بی نے انہیں دیکھتے ہی بڑے سلیقے سے اپنی سیاہ شال کا پلو سر پر اوڑھ لیا تھا۔ مگر سیاہ شال کے حالے میں ان کا چہرہ یوں جگمگا اٹھا تھا جیسے کالے بادلوں کی اوٹ سے چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا ہو جبکہ ان کے گھنے ریشمی بال ان کی چادر سے نکل کر گھٹنوں کو چھو رہے تھے اور ان سے پانی کی منہی، منہی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ تین جوان بیٹیوں کی عمر رسیدہ ماں لگنے کے بجائے کچی عمر کی لہزد و شیزہ دکھائی دے رہی تھیں۔

فیصل میاں کو یوں تک اپنی جانب مسلسل تکتے پا کر آسیہ کچھ نروس سی ہو رہی تھیں اور پلکیں گرائے زمین پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ فیصل میاں سرد آہ بھر کر رہ گئے۔ انہیں اب تک یاد تھا کہ جب پہلی بار انہوں نے آسیہ بی کو بدر کی دلہن کے روپ میں دیکھا تھا تو اسی وقت ان کا دل ایک انجانے سے احساس سے دھڑک اٹھا تھا۔ آسیہ بی

کی من موہنی سی صورت ان کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس وقت آسیہ بی بے حد کسن اور شوخ و چنپل ہوا کرتی تھیں۔ بات بے بات ان کے لبوں سے ہنسی کے فوارے چھوٹا کرتے اور جب ہنستے ہوئے ان کے گالوں میں پھنور پڑتے تو نہ چاہتے ہوئے بھی فیصل کے لیے بدر کی نئی نویلی دلہن کے چہرے سے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی بہانے عاتکہ بیگم کے ہمراہ بدر الدین سے ملنے ان کے گھر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اور اگر خود کسی سے وجہ سے نہ جاسکتے تو اپنے ہاں ان سب کو مدعو کر لیا کرتے اور یوں بہانے سے آسیہ کے ملکوتی حسن سے اپنی آنکھیں سینکا کرتے تھے تو کبھی بے تکلفی سے ہنسی مذاق بھی کر لیا کرتے تھے اور کبھی لینے یا کچھ دینے کے وقت اگر ان کا ہاتھ آسیہ بی کے ہاتھ سے چھو جاتا تو ان کے اندر ایک کرنٹ سا دوڑ جایا کرتا۔

بلاشبہ مرد فطرتاً ایک رومانوی مخلوق ہے اور اسے اگر پیدائشی حسن پرست کہا جائے تو غلط نہ ہوگا مگر فیصل تو ان معاملات میں بہت ہی دل پھینک اور عاشق مزاج واقع ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کی بیگم عاتکہ خاتون بذات خود بھی اچھی خاصی خوش شکل اور پُرکشش شخصیت کی مالک تھیں مگر فیصل کے لیے گھر کی مرغی دال برابر والی بات تھی۔ ویسے بھی پیدائشی دل پھینک اور عاشق مزاج مرد زیادہ عرصے تک کسی ایک عورت کی زلفوں کے اسیر نہیں رہتے۔ اور شادی کے بعد اپنی بیگم پر بھی اس وقت تک ہی فدا رہتے ہیں جب تک اپنی مون کا دور رہتا ہے۔ جیسے ہی بیوی کے چہرے سے میک اپ اور ہاتھوں سے مہندی اترے زندگی روزمرہ معمول کی پٹری پر چڑھ جاتی ہے اور بریفوم کی خوشبوؤں سے ہٹ کر جب عورت مرج، مسالوں اور لہسن، پیاز کی بساند میں رچے بے وجود کے ساتھ گھر کے سودے سلف اور سبزی و ترکاری کی باتیں شروع کر کے گھر بیلو سیاست میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کرتی ہے اور شوہر کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اس کے پیارے رشتوں کے خلاف اس کے کانوں میں زہر گھولنے کی کوشش کرتی ہے تو وہیں رومیٹک مزاج شوہروں کے اندر کارومانس دم توڑنے لگتا ہے۔ ناز و ادا دکھاتی ہوئی بیوی انہیں انتہائی بیکار، جاہل، پھوہڑ، بد عقل، بد مزاج، دماغ کھانے والا دائرس اور خون چوسنے والی بلا لگنے لگتی ہے۔ اسی وقت یہ رومانی مزاج مرد اپنے دل میں یہ طے کر لیتا ہے کہ اس طرح کی بیوی سے اس کا جہا ہونا مشکل ہے اور دونوں کی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو سکتی مگر وہ معاشرتی و خاندانی دباؤ کی وجہ سے خاموش ہو جاتا ہے مگر اپنی پسندیدہ عورت سے محرومی کا احساس اسے چین نہیں لینے دیتا۔

اور مرد کی پسندیدہ عورت بننا اتنا ہی بھی مشکل کام نہیں کیونکہ ایک رومانوی مزاج رکھنے والے مرد کو تو رفاقت کے لیے نرم دل، نرم مزاج، معصوم صورت اور خوب صورت باتیں کرنے والی ایسی لڑکی چاہیے ہوتی ہے جو زمانے کی اونچ نیچ سے ناواقف اور گھر بیلو سیاسی جراثیم سے پاک ہو، جسے تنہائی میں اچھی باتیں کرنے کا ہنر آتا ہونا کہ شکایتیں کرنے کا..... جو ہر بات میں اپنے مرد کا حوصلہ بڑھائے تاکہ اس کا حوصلہ ڈھائے۔ جسے ہاں میں ہاں ملانا آتا ہو، جو ہر دکھ سکھ میں اپنے مرد کے ساتھ کھڑی ہو..... اور مرد اگر اس کے حسن و سلیقے کی تعریف کرے تو وہ بھی اپنے مرد کی انتظامی صلاحیتوں، اس کی کاروباری و پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو سراہے اور اس کے ذوق حسن کو کھل کر داد دے..... جس عورت میں یہ گن ہوں تو مرد ایسی عورت کے آنچل کے پلو سے بندھا رہتا ہے مگر جو عورت ہر وقت مرد کے آگے اپنے مسائل کا رونا روتی رہے اور محض خاوند کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اپنی معمولی سی طبیعت کی خرابی کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرے اور ادھر ادھر کی باتیں اپنے مفاد کے حصول کی خاطر خاوند کے کانوں میں ڈالتی رہے تو ایسی عورت سے رومانی مزاج مرد کو سوں دور بھاگتا ہے اور اپنی محبت کی طلب پوری کرنے کے لیے کوئی اور وجود ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا ہے اور بیوی کو وہ صرف اپنی ضرورت پوری کرنے تک محدود رکھتا ہے اور کبھی، کبھی تو اس کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتا پھر وہ اگر بظاہر گھر پر بھی موجود ہو تو دلی و دماغی طور پر وہاں حاضر نہیں ہوتا اور اپنی خوابوں کی

حوصلہ بشرط وفاتھرا

”ملکہ“ کے ساتھ تصورات کی دنیا میں کھویا رہتا ہے اور بیوی سمجھتی ہے کہ شوہر صرف ہمارا ہے اور ہمارے ہی حکم کا غلام ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔

اور فیصل میاں کا تو معاملہ ہی الگ تھا، لڑکپن کی عمر سے ہی وہ تو عاشق و معشوقی کے کھیل میں طاق تھے۔ ہر قسم کی جوان لڑکیوں بالیوں حتیٰ کہ باجیوں تک سے محبت کا انہیں پرانا تجربہ تھا مگر کبھی انہوں نے غلط قسم کی عورتوں سے غلط مراسم نہیں رکھے تھے۔ ان کے نزدیک پیار و محبت کی طلب جسمانی بے راہ روی نہیں..... وہ تو بس الفت کی آنکھ مچولی کے کھیل کا لطف اٹھاتے تھے، وصل و فراق کے جذباتوں میں ڈوب کر خود کو کسی پرانی رومانی فلم کے ہیرو کا کردار سمجھ کر خوش و مطمئن رہا کرتے تھے۔ چند روزنی نویلی محبت کا دم بھرتے اور ناز اٹھاتے مگر پھر جب دل بھر جاتا تو کسی اور سمت نکل جاتے۔

گھر اسانولارنگ، ناٹاقد، بھاری جسامت، چھدرے دانتوں اور گھنگرالے بالوں کے باوجود نو جوان لڑکیاں ان کے ارد گرد اس لیے بھی خوشی سے منڈلاتی رہتی تھیں کہ وہ ان سب کی سبھی فرمائشیں ہنسی خوشی پوری کر دیا کرتے تھے اور پیسہ خرچ کرنے میں بکل سے کام نہیں لیتے تھے۔ ہنس مکھ، ملنسار، خوش مزاج اور خوش اخلاق ہونے کے ساتھ انہیں خواتین کی تعریف کرنے اور انہیں خوش رکھنے کا ہنر آتا تھا۔ اور شادی کے بعد عاتکہ بیگم بھی اپنے شوہر کی انہی خوبیوں کی معترف تھیں اور خاندان بھر میں ہر جگہ فیصل میاں کے گن گایا کرتیں۔ اذھر آسیہ بی جب اپنی نند کی زبانی اپنے نندوئی جی کی تعریفیں سنتیں تو جل بھن جایا کرتیں کہ ان کی دونوں نندوں نے اپنے خاوندوں کو تو اپنے آگے بندہ بے دام بنایا ہوا ہے اور اذھر ایک میرا شوہر ہے جو اپنی ماں، بہنوں کا اتنا قدر دان اور فرمانبردار ہے کہ ان کے خلاف کوئی بات نہیں سنتا اور ماں، بہنوں کے اشارے پر چلتا ہے۔



ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ

کے صفحات پر بہت جلد ایک نئے سلسلے کا آغاز

جنگل کا فٹانوں نافذ کرنے والے انسانی تذلیل کے مرتکب درندوں سے ٹکرا جانے والوں کی خونی داستان

جنگل

امجد جاوید کے قلم سے

فیصل میاں کی بہت ساری خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ان کے سارے معاشرے گھر سے باہر تک محدود تھے جبکہ خاندان میں وہ عاتکہ بی کے زن مرید شوہر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے دل و دنیا کے سب معاملات بڑی عمدگی سے چل رہے تھے کہ ایسے میں ایک دن اچانک ہی آسیہ بی، بدرالدین کی دلہن بن کر چھم سے ”بدر مینشن“ میں چلی آئیں اور یہیں سے سیدھی اپنے نندوئی کی آنکھوں کے راستے دل میں سما گئیں۔

اگر فیصل میاں کو کبھی پہلے آسیہ بی مل جائیں تو شاید وہ انہیں اپنی شریک حیات بنانے میں دیر نہ لگاتے اور اپنا دل فوراً ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے مگر اب معاملہ صرف بے بسی کا تھا۔ فیصل میاں اپنے اور آسیہ بی کے درمیان رشتے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اسی لیے پھونک، پھونک کر قدم رکھتے تھے مگر دل آوارہ سے مجبور تھے اسی لیے جب اور جہاں موقع ملتا، وہ آسیہ بی سے ہنسی مذاق کر کے اپنے ٹھکر ضرور پوری کر لیا کرتے اور حیلے بہانے آسیہ بی کے گرد منڈلاتے ہوئے رومانوی گیت گنگناتے رہتے۔

کبھی میں سوچتا ہوں کچھ نہ کچھ کہوں
پھر یہ سوچتا ہوں کیوں نہ چپ رہوں
زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں
دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں
آرزو یہ ہوتی ہے اپنا کہہ سکوں

حد تو یہ تھی کہ وہ کچن میں بھی آسیہ بی کا پیچھا نہ چھوڑتے اور کوئی نہ کوئی فرمائشی پروگرام لیے وہیں پہنچ جاتے۔ بدرالدین کی شادی کے بعد سے فیصل میاں کی بدر مینشن میں آمد و رفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی اور ہر بار آسیہ بی ان کی مرکز نگاہ ہوتیں۔

شروع میں تو گھر میں سے کسی نے فیصل میاں کی آسیہ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کا نوٹس نہیں لیا تھا مگر پھر دھیرے، دھیرے سب سے پہلے عارفہ بیگم نے یہ سب کچھ نوٹ کرنا شروع کیا تو فوراً بہن کو خبردار کیا اور یوں عارفہ بیگم کے خبردار کرنے پر عاتکہ بیگم نے بھی اپنے شوہر کی نظروں سے ان کے من کی چوری کو پکڑ لیا تھا اور پھر غیر محسوس طریقے سے ان کی گوشمالی شروع کی اور ان کی بھٹکتی نظروں اور چھوڑی حرکتوں کا کڑا پہرہ دینا شروع کیا۔ فیصل میاں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ بیگم کی نظروں میں آچکے ہیں لہذا انہوں نے خود ہی بیوی کی بے جا روک ٹوک اور الٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے بدر مینشن جانا کم کر دیا۔ وہ خود کو بیوی اور سسرال والوں کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتے تھے اس لیے آسیہ بی کی طرف جانا پہلے محدود اور پھر تقریباً ختم ہی کر دیا تھا۔ مگر آسیہ بی سے متعلق مختلف خبریں اور باتیں گردش کرتی ہوئی ان تک پہنچتی رہی تھیں۔ کبھی مندوں سے کھٹ پٹ چل رہی ہے تو کبھی ساس کے ساتھ بدتمیزی ہو رہی ہے اور کبھی شوہر سے ناچاقی کی خبریں گردش کرتی رہتیں۔ الغرض آسیہ بی ہمیشہ خاندانی خبر نامے کی بریکنگ نیوز بنی رہتیں۔ پھر معلوم ہوا کہ بچیوں کی پیدائش کے بعد سے وہ نفسیاتی مریضہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اور ان پر اکثر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں اور وہ غصے میں جیتی چلاتی بھی ہیں۔ فیصل کی دلی ہمدردیاں آسیہ بی کے ساتھ تھیں مگر وہ خاموش رہتے۔

پھر ان باتوں کو کبھی ایک عرصہ گزر گیا۔ ادھر فیصل میاں اور عاتکہ بی کے بچے جوان ہو گئے تو دوسری جانب بدرالدین اور آسیہ بی کی بچیاں بھی جوانی کی حدوں کو چھونے لگیں۔ کبھی خاندان میں کوئی تقریب منعقد ہوتی تو وہاں آسیہ بی نظر آ جاتیں تو فیصل میاں کے گویا من کی کلیاں کھل اٹھتیں اور آنکھوں میں پھلجھریاں سی چھوٹنے لگ جاتیں۔ پھر چند سال اور دے پاؤں سرک گئے اور ایک دن اچانک خبر ملی کہ بدرالدین نے آسیہ کو طلاق دے دی ہے اور وہ سب سے چھوٹی بیٹی مرزا کے ہمراہ اپنے بھائی امجد کے پاس چلی گئی ہیں۔ یہ خبر سن کر فیصل میاں کا دل مارے خوشی

کے بلیوں اچھلنے لگا..... اور ان کا جی کیا کہ فوراً جا کر آسیہ بی سے ملیں اور انہیں تسلی دیں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ”وہ“ ہیں ناں..... آسیہ بی کا خیال رکھنے کے لیے۔ مگر وہ یہ سوچ کر رک گئے تھے کہ کہیں مہر جا کر یہ بات نہ بتا دے کہ فیصل پھوپھا (آسیہ بی) سے ملنے آتے ہیں۔ تو اس صورت میں التالیف کے دینے پڑ جاتے۔ مگر اب تو عارف کی تلاش کے بہانے انہیں آسیہ بی سے ملاقات کا بہانہ مل گیا تھا تو وہ موقع ضائع کیے بغیر فوراً یہاں پہنچ گئے تھے۔

”میں نے سنا تو حیران رہ گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ بدرالدین نے کچھ اچھا نہیں کیا کہ اپنی اتنی اچھی بیوی کو یوں طلاق دے دی۔ بھلا کیا کی تھی آپ میں.....؟“ انہوں نے آسیہ بی کی دکھتی رگ پر اچانک ہی ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جواباً آسیہ بی ہچک کر رونے لگیں تو فیصل میاں اپنی جگہ بے چین سے ہواٹھے۔

”ارے..... پلیز روئیں تو نہیں..... میرا دل کرچی، کرچی ہونے لگتا ہے، اتنی خوب صورت آنکھیں اس۔ نا قدرے اور ظالم انسان کے لیے آنسو بہانے کو تو نہیں دیں اللہ میاں نے۔“ فیصل میاں اس وقت ”ماں سے زیادہ چاہے، پھاپھا کٹنی کہلائے“ کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آسیہ بی کو گلے لگا کر ان کے آنسو پونچھ لیں مگر مجبور تھے۔

اتنی دیر میں ممانی (ملازمہ ہونے کے باوجود) چائے کی ٹرے خود اٹھائے چلی آئیں۔

”ارے..... آپ نے چائے کا تکلف کیوں کر لیا.....؟“ فیصل میاں نے سرسری سا کہا تو حسنہ کوئی بات نہیں کہہ کر کپوں میں چائے دانی سے بھاپ اڑاتی چائے اٹھیلنے لگیں۔ اسی اثنا میں فیصل کے موبائل پر نوٹیفیکیشن ٹون بجی۔

فیصل نے موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی تو وائس ایپ پر عاتکہ کا میسج آیا تھا کہ عارف کچھ دیر ہوئی گھر واپس آ گیا ہے۔ فیصل نے یہ میسج نوٹیفیکیشن میں پڑھ لیا اور وائس ایپ میسج نہیں اوپن کیا اور نہ انہیں عاتکہ بی سے تفصیل سے بات کرتی پڑ جاتی اور ممکن تھا کہ فیصل میاں کو آن لائن پا کر عاتکہ جھٹ سے کال کر لیتیں تو انہیں کال اینڈ کرنی پڑ جاتی۔ اس میسج کے بعد انہوں نے موبائل ہی آف کر کے جیب میں ڈال لیا تاکہ میسج یا کال کا خطرہ ہی نہ رہے۔

”چائے لیجیے ناں..... ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ آسیہ نے انہیں چائے کی طرف متوجہ کیا تو وہ مسکرا دیے۔ ”چائے اگر اتنی چاہ کے ساتھ ہو تو انکار کی ہمت کوئی کہاں سے لائے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے آسیہ بی کی جانب دیکھا اور چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

آسیہ بی اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئیں۔ ”یہ بسکٹ بھی لیجیے ناں بھائی صاحب..... سچ میں بہت مزے کے ہیں.....“ ممانی نے بسکٹوں کی پلیٹ آگے سرکائی۔ ”آپ نے بتائے ہیں.....؟“ فیصل میاں نے بسکٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا تو ممانی گڑبڑا کر شرمندگی سے مسکرائیں۔ ”میں نے نہیں بنائے، بازار سے منگوائے ہیں مگر ہیں بہت مزے کے۔“ ممانی نے وضاحت کی تو فیصل میاں ہنس کر چپ ہو رہے پھر ممانی سے ماموں کی خیر خیریت پوچھنے لگے۔

ممانی کے بتانے پر فیصل میاں کچھ چپکے سے ہو رہے پھر قدرے توقف کے بعد وہ ممانی سے ان کے شوہر کی جاب کے متعلق اور پھر براہ راست ماہانہ تنخواہ پوچھنے لگے۔ اور جب ممانی نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ ماموں کی ماہانہ تنخواہ بتائی تو وہ حیران رہ گئے۔

”ارے اتنی قلیل تنخواہ میں آپ لوگ گزارہ کس طرح کر پاتے ہیں اب تو مہنگائی بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔“ فیصل میاں نے بغیر لگی پٹی رکھے صاف الفاظ میں پوچھا لیا تھا۔ ”بس فیصل بھائی..... اپنی سفید پوچی کا بھرم رکھتے ہیں ہم لوگ، باقی پورا کرانے والی ذات تو اس رب کی

ہے۔“ ممانی نے سرد آہ بھرتے ہوئے گول مول سا جواب دیا اور جان بوجھ کر آسیہ اور مرزا کی وجہ سے بدرالدین کی مستقل بنیادوں پر لگائی ہوئی ”ماہانہ مالی امداد“ اور انہی کی عطیہ کردہ جائیدادوں اور پلازوں سے آنے والی لاکھوں کی ماہانہ آمدنی کے ذکر کو سرے سے گول کر گئیں..... اور بس ٹھنڈی آہیں بھر کر روز بروز آسمان کو چھوتی ہوئی مہنگائی اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کا ذکر کرتی رہیں۔

”اچھا، اچھا چلیں رب سو ہٹا کرم فرمائے گا ان شاء اللہ.....“ فیصل میاں نے اپنے تئیں حسہ ممانی کو تسلی دیتے ہوئے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کارڈ نکالا اور حسہ بیگم کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ رکھ لیجیے حسہ بہن..... میرا وزینگ کارڈ ہے۔ آپ امجد صاحب کو کہیے گا کہ میرے آفس خود سے ملنے ضرور تشریف لائیں..... اے ایف بلڈرز میری ہی کمپنی ہے، ہم نے نہ صرف اپنے ملک کی مشہور بلڈنگز، پلازے اور ہاؤسنگ سوسائٹیز بنائی ہیں بلکہ بیرون ملک بھی کافی پراجیکٹس پر کام کیا ہے اور آج کل بھی میں اپنی ذاتی انویسٹمنٹ سے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بنوا رہا ہوں تو اس پراجیکٹ میں مجھے امید ہے کہ امجد صاحب کے لیے بھی کوئی نہ کوئی جاب ضرور نکل آئے گی، تنخواہ بھی بہت اچھی ہوگی اور سال میں دو بار بونس بھی ملے گا۔ کمپنی کی طرف سے کار بھی ہو جائے گی اور اس کے علاوہ ایک چودہ مرلے کا فرنشڈ گھر بھی ہماری کمپنی کی جانب سے انہیں گفٹ کیا جائے گا۔“

فیصل میاں کے اس اعلان نے تو ممانی کو بالکل ہی ڈھیر کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو کم صم کھڑی ہونفوں کی طرح ان کا منہ بکتی رہی تھیں۔ جیسے انہیں ان کی باتوں کا یقین نہ ہو اور وہ اگر اپنی جگہ سے ہٹیں گی تو پتھر کی ہو جائیں گی یا یہ خوب صورت سپنائوٹ جائے گا پھر اپنی اس کیفیت پر قابو پا کر وہ ذرا سنبھلیں بھی تو بس شکریہ ہی کہہ سکی تھیں۔

فیصل میاں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر بادل ناخواستہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”دل تو نہیں چاہ رہا مگر مجبوری ہے جانا تو پڑے گا ہی.....“ انہوں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اعلان کیا تو حسہ بی چہرے پر خوشامد نہ مسکراہٹ سجائے فوراً بول اٹھیں۔

”ابھی ذرا سی دیر تو ہوئی آپ کو آئے، کچھ دیر اور رک جاتے تو آپ کی ملاقات امجد صاحب سے یہیں ہو جاتی۔ وہ بھی آفس سے بس آنے والے ہی ہوں گے..... میں اتنی دیر میں آپ کے لیے کھانے کے ساتھ، ساتھ کچھ میٹھا بھی بنواتی ہوں۔“ ممانی اٹھنے لگیں۔

”ار..... رہ..... بے نہیں حسہ بہن۔ یہ کھانے اور میٹھے کا تکلف آج تو رہنے ہی دیں..... میں ویسے بھی شوگر کا مریض ہوں۔ میٹھے کا پرہیز ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو آگے چل کر منہ میٹھا کرنے کے بہت مواقع آئیں گے۔ پھر جتنا مرضی کھلایے گا میٹھا مگر شوگر فری.....“ انہوں نے ہنستے ہوئے کن انکھوں سے آسیہ بی کی جانب دیکھا۔ وہ ساری گفتگو سے انجان بنیں اپنی کلائی میں پڑے ننگن سے کھیل رہی تھیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں..... مولا کرم فرمائے اور ایسا خوشیوں بھرا موقع جلد لائے.....“ ممانی نے کچھ سوچے سمجھے بغیر جھٹ سے فیصل کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے صدق دل سے دعا دی تو وہ اپنی گھنی مونچھوں تلے مسکرا دیے اور ”الہی آمین“ کہتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنا ہاتھ ڈال کر نکالا اور جس طرح جادوگر جیب سے کیڑا برآمد کرنا ہے اسی طرح نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر آسیہ بی کی جانب بڑھا دی۔

”یہ رکھ لیں آسیہ! میں جلدی میں آپ کے لیے کچھ نہیں لاسکا تھا تو آپ ان پیسوں سے اپنے لیے کوئی اچھی سی شاپنگ کر لیجیے گا.....“ انہوں نے نوٹوں کی گڈی والا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”نہیں..... نہیں..... میں یہ نہیں لے سکتی..... تو.....“ آسیہ بی اچھل کر ایسے پیچھے ہٹیں جیسے فیصل میاں کے ہاتھ میں نوٹ نہیں بلکہ سانپ، بکھو ہوں۔

”میں تو اپنی ساری شاپنک کر چکی ہوں..... آپ کا بہت شکریہ.....“ آسیہ نے بمشکل تمام اپنا ادھورا جملہ مکمل کیا اور ساتھ ہی مدد طلب نظروں سے بھاوج کی جانب دیکھا مگر وہ تو ابھی تک فیصل میاں کی امجد کی نوکری کے حوالے سے کی گئی باتوں کے سحر میں مبتلا تھیں اس لیے جواباً آسیہ بی کو گھور کر رہ گئیں۔

فیصل میاں کا نوٹوں کی گڈی والا ہاتھ اب بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔

”ارے لے لو آپا..... اب فیصل بھائی اگر اتنے پیار سے دے رہے ہیں تو ان کا دل مت توڑو.....“ حسہ نے ایک بار پھر تنبیہی نظروں سے آسیہ بی کو گھورا۔

آسیہ بی عجیب محضے میں تھیں۔ تب فیصل نے جرأت سے کام لے کر زبردستی آسیہ کا ہاتھ تھاما اور روپے تھما دیے۔ ناچار آسیہ کو روپوں کی گڈی پکڑنی پڑی تھی۔

آسیہ روپے پیسے کی بھوکی نہیں تھیں۔ شوہر کے گھر ہمیشہ سے ان کا ہاتھ اس معاملے میں کھلا رہا تھا۔ اور طلاق ہونے کے باوجود بدر میاں نے پوری کوشش کی تھی کہ ان کی مطلقہ اور بچی کسی کے محتاج نہ ہوں اور ہمیشہ کی طرح ٹھٹھاٹ باٹ والی زندگی گزاریں اسی وجہ سے آسیہ بی کو فیصل میاں کا ترس کھا کر ان کی مدد کے خیال سے اتنی بڑی رقم دینا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر دوسری جانب ان کی بھاوج حسہ بڑی مطمئن اور مسرور نظر آرہی تھیں کیونکہ آسیہ کے بعد فیصل نے حسہ کو بھی اچھی خاصی بھاری نوٹوں کی گڈی یہ کہہ کر تھما دی تھی کہ وہ پہلی بار آئے ہیں اور حسہ بی کے بچوں کے لیے کچھ نہیں لے کر آئے۔ خالی ہاتھ آنا انہیں اچھا نہیں لگ رہا لہذا ان پیسوں سے بچوں کو کچھ لے دیجیے گا..... حسہ بی نے کچھ دیر تو اوپرے دل سے نہیں نہیں کی اور پھر ہنستے مسکراتے ہوئے نوٹ پکڑ لیے۔

”آپ نے یوں اچانک بغیر اطلاع کے میری آمد کا برا تو نہیں مانا.....؟“ انہوں نے براہ راست آسیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”ارے نہیں، نہیں..... کیسی غیروں والی باتیں کر رہے ہیں فیصل بھائی..... یہ آپ کا اپنا گھر ہے جب دل چاہے بے دھڑک چلے آیا کریں..... اس میں برا ماننے والی بھلا کیا بات.....؟“ آسیہ کے بجائے حسہ نے انہیں جواب دیا تھا۔

”جی بہت شکریہ..... آپ کی اس محبت اور اجازت کا..... ممکن ہے کبھی، کبھی آپ کے ہاتھ کی چائے پینے آجایا کروں.....“ وہ بے حد شائستہ لہجے میں مسکراتے ہوئے بولے تو حسہ نہال ہی ہوا تھیں۔

”ضرور، ضرور..... صرف چائے کیوں.....؟ میں کسی دن اپنے ہاتھ کے بنے کوفتے اور نیننی پلاؤ بھی کھلاؤں گی آپ کو.....“ ممائی نے بلاوجہ اپنی بیٹی کی نمائش کرتے ہوئے شہد سے گندھے لہجے میں کہا۔

”اچھا تو آسیہ اب میں چلوں.....؟“ انہوں نے ایک بار پھر براہ راست آسیہ کو مخاطب کیا۔

آسیہ نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

”معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کا نام لینے کی گستاخی کر رہا ہوں مگر اب ان حالات میں بھابی کہنا تو بنتا نہیں..... اس لیے آپ کو آپ کے اسم گرامی سے پکارنا پڑا ہے اور میرے خیال سے یہی مناسب ہے آپ بھی مجھے فیصل کہہ سکتی ہیں.....“ وہ مسکرا کر بولے تو آسیہ اپنی طرح خاموش کھڑی رہیں..... مگر پھر حسہ کے کھودنے پر جبرا مسکرا دی تھی۔

”بدر الدین کی پارٹی کا بندہ مت مجھے گا..... میں تو شروع سے ہی آپ کے فیور میں ہوں.....“ انہوں نے شوخی سے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو آسیہ بی گھبرا اٹھیں۔

وہ تو شکر ہوا کہ ان کی یہ حرکت حسہ نے نہیں دیکھی۔ ورنہ تو اپنے مطلب کے معنی پہنا کر ایک کی چار لگاتیں اپنے شوہر کو.....

آسیہ کو نو عمر لڑکیوں کی طرح گھبراتے، کتراتے دیکھ کر فیصل نے دھیرے سے معنی خیز قہقہہ لگایا اور الوداعی سلام پیش کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

حسنہ! انہیں گیٹ تک رخصت کرنے گئیں تو باہر کھڑی ان کی بڑی ساری چچماتی کار دیکھ کر اور بھی متاثر ہو گئیں اور زور سے ہاتھ ہلا کر مسکراتے ہوئے انہیں ”ٹانا“ کرنے لگیں۔

”بے شرم، ڈھیٹ کہیں کا..... میرے پیچھے یہاں بھی آن مرا.....“ آسیہ نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔
 ”بھئی خدا لگتی کہوں گی آپا کہ تمہاری پوری سسرال میں ایک یہی بندہ کام کا آدمی لگا مجھے..... خوف خدا رکھنے والا اور دوسروں کا احساس کرنے والا ورنہ تو آج کے زمانے میں کسی کو کیا پڑی جو دوسروں کی خبر گیری کرتا پھرے..... مگر دیکھ لو وہ تمہارا پتا کرنے یہاں تک چلا آیا۔“ حسنہ، فیصل کو رخصت کرنے کے بعد وہیں آسیہ کے قریب آ بیٹھی تھیں۔

”ضرور دال میں کچھ کالا ہے..... یہ خبر گیری کرنے نہیں بلکہ کسی خبر کی تلاش میں یہاں آیا ہوگا..... یہ بھی ممکن ہے کہ اسے عارفہ یا عاتکہ نے خود کسی مقصد سے بھیجا ہو۔“ آسیہ بی کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

”آئے ہائے، ان کا اب اور کیا مقصد ہوگا بھلا؟ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ بھلا مانس خود ہی پتا کرنے آ گیا تھا اور اتنے پیسے بھی دے گیا۔ عارفہ و عاتکہ بھلا پیسے کیوں بھیجتیں ہمارے لیے؟“ حسنہ بی کی سوچ پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔

”وہ دولت کی جھلک دکھا کر مجھے گھیرنا چاہتا ہے شاید..... مگر میں کوئی کچی عمر کی لڑکی تو نہیں ہوں جو اس کے جال میں پھنس جاؤں۔“ آسیہ بی شاید منہ میں بڑبڑاتی تھیں مگر حسنہ نے سن لیا۔

”کیا؟ ذرا پھر سے کہنا آپا.....“ حسنہ نے ناک پر انگلی رکھ کر سرگوشی میں پوچھا۔

”بدرالدین نے بتایا تھا ایک بار..... مجھے فیصل سے محتاط اور فاصلے پر رہنے کے لیے کہا تھا انہوں نے۔“

”تمہاری نند عاتکہ کو معلوم ہے یہ بات.....؟“ حسنہ نے پوچھا۔

”شاید نہیں! وہ تو ہر ایرے غیرے کے آگے اتنی تعریفیں کرتی ہیں اپنے شوہر کی کہ بیان سے باہر.....“ آسیہ نے کہا یا تو حسنہ سر ہلانے لگیں۔

”سمجھ گئی..... کچھ مرد سانپ کے مانند ہوتے ہیں، گھر سے باہر ہمیشہ بل کھا کر چلتے ہیں مگر جب اپنے بل میں مکتے ہیں تو بالکل سیدھے..... یہ فیصل میاں بھی کچھ ایسے ہی لگتے ہیں۔“ آسیہ نے حسنہ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔

”مگر آپا..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ فیصل میاں سچ میں تم سے دلی ہمدردی رکھتے ہوں یا تمہیں پسند کرتے ہوں اور تمہاری نند کے آگے تمہاری فیور کرتے ہوں..... اسی لیے بدرالدین نے تمہیں نفرت دلانے کے لیے برائی کی ہو ان کی۔“ حسنہ بی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”جو بھی ہے مگر مجھے خود بھی یہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا.....“ آسیہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔
 ”تم اگر ذرا میرے مشورے پر چلو تو فیصل میاں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر سکتی ہو آپا.....“ حسنہ نے آنکھیں نچائیں۔

”وہ کسے.....؟“ آسیہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

”تم یہی کہتی ہو ناں نہ تمہاری نندوں نے بدرالدین کو ہمیشہ تمہارے خلاف کیے رکھا تو اس سے بہتر موقع ان سے انتقام لینے کا تمہیں اور کب ملے گا بھلا! تم چاہو تو فیصل میاں کو قابو کر کے اپنے سسرال میں نندوں سمیت بدرالدین کو لگبی

حوصلہ شرط وفائتھرا

آٹھ، آٹھ آنسو لاسکتی ہو، ذرا نہیں بھی تو معلوم ہو کہ طلاق دی کیسے جاتی ہے کسی معصوم عورت کو..... اور اگر تم اب بھی بدرالدین کے گھر واپس جا کر دوبارہ سے بسنا اور آباد ہونا چاہتی ہو تو تب بھی یہ فیصلہ تمہارے بہت کام آسکتے ہیں۔ تم بس انہیں اپنی مٹھی میں رکھو.....“ حسنہ ممائی کا دماغ اک شیطانی چرغہ ہی تو تھا جس سے وہ ہر لمحہ اوٹ پٹانگ سوچوں کے تانے بانے اور سازشیں بنتی رہتی تھیں اور اب فیصلہ میاں سے ذاتی مفاد کے لیے ان کے ذہن نے فوراً ہی ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا جس میں وہ آسیہ کو بطور مہرہ چلنے جا رہی تھیں۔

”مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آئی.....“ آسیہ بی نے پلکیں جھپکائیں۔

حسنہ نے ادھر ادھر دیکھا اور آسیہ کو کان نزدیک لانے کا اشارہ کیا اور جھک کر ان کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں انہیں کچھ سمجھانے لگیں۔

آسیہ جیسے، جیسے حسنہ کی بات سنتی اور سمجھتی جا رہی تھیں ویسے ویسے ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔

”السلام علیکم!“ مرحا نے اچانک اسی وقت انٹری ماری تھی۔

مما اور ممائی کو سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھیں۔

”پوچھ سکتی ہوں کہ یہاں کیا چل رہا ہے؟ اور وہ ہمارے پھوپھا جان کو آج ہماری اچانک سے کیسے یاد ستا گئی؟

سب خیریت ہے ناں؟“ مرحا نے پوچھا۔

”تم اچانک سے کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ آکر سلام ہی کر لیتیں پھوپھا کو.....“ مرحا کے سلام کا جواب دینے

کے بعد آسیہ بیگم نے ایک نظر اس پر ڈالی اور بولیں۔

”سواری مگر ممائی جان نے میری ڈیوٹی بچوں کو سنبھالنے کے لیے لگائی ہوئی تھی تو انہیں سلاتے ہوئے میری

بھی آنکھ لگ گئی تھی۔“

”کل تمہارے پاپا کا نکاح و بارات ہے..... تمہیں انوائٹ نہیں کیا انہوں نے.....؟“ ممائی نے مرحا سے پوچھا۔

”ابھی پاپا کی کال سے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ وہ تو خود مجھے لینے کے لیے آنا چاہتے تھے۔ اور زونی آپنی اور

ازنا بھی گھر آنے کا اصرار کر رہی ہیں..... مگر میں نے انکار کر دیا۔“

”چلی جاتیں تم بھی..... میں نے تو منع نہیں کیا.....“ ممائی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا جو بدرالدین کی بارات

کے ذکر پر آنکھوں پر آگئے تھے۔

”کیسے چلی جاتی آپ کو رونا دھونا چھوڑ کر۔“ مرحا، ممائی کے قریب آگئی اور انہیں گلے لگا کر پیار کرنے لگی۔

”زونا نشہ اور ازنا تو خوشی، خوشی تیار ہوں گی باپ کی باراتی بننے کے لیے تو تم بھی چلی جاؤ بے شک..... میرا کیا

ہے..... یہ رونا دھونا تو اب میری زندگی کا حصہ ہے۔“ آسیہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگیں۔

”پلیز یوں تو مت روئیں ممائی..... ورنہ میں بھی رو دوں گی.....“ مرحا اپنی انگلیوں کی پوروں سے ممائی کے آنسو

پونچھنے لگی تھی۔

”زونی آپنی اور ازنا کی بات اور ہے ممائی..... وہ پاپا کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتی ہیں تو پاپا کی خوشی میں ہی ان

دونوں کی بھی خوشی ہے۔ جبکہ میں آپ کے ساتھ ہوں تو آپ کا ہر دکھ میرا دکھ ہے ممائی۔“ مرحا ماں کو اپنے بازوؤں میں

سیٹے انہیں روتے سے چپ کر رہی تھی۔ ماں تو خیر ماں ہوتی ہے لیکن اگر ماں کبھی کسی کرب میں مبتلا ہو تو ایک بیٹی بھی

بالکل ماں ہی کی طرح اپنی ماں کا دکھ سکھ بانٹتی، اسے گلے لگاتی، اس کی دیکھ بھال کرتی اور دلا سے دیتی ہے۔ اور یہی

اب مرحا کر رہی تھی کہ ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے انہیں گلے لگا کر خود بھی ان کے دکھ پر آنسو بہا رہی تھی۔



عرشان کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے اس کے بچپن کا دوست طلال اسود کھڑا تھا۔ دونوں پر انٹری سیکشن میں نہ صرف دوست اور کلاس فیلورہ چکے تھے بلکہ ان کا گھر ایک ہی اسٹریٹ میں ایک دوسرے کے گھر کے نزدیک ہی تھا، طلال کے والد کسی کمپنی میں چیف انجینئر کے عہدے پر فائز تھے اور کمپنی کی طرف سے ہی کینیڈا بھیجے جانے پر وہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنا گھر بھی فروخت کر دیا تھا اور اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا اب وطن واپسی کا کوئی ارادہ نہیں، شروع میں تو طلال، عرشان کو کالز کر لیا کرتا تھا اور دونوں دوستوں کی کپ شپ ہو جایا کرتی تھی اور میسجز پر بھی رابطہ رہتا تھا مگر آہستہ، آہستہ یہ روابط کم ہوتے، ہوتے تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئے کیونکہ دونوں اپنی، اپنی جگہ مصروف ہو گئے تھے مگر آج ایک طویل عرصے بعد ایک دوسرے کو یوں اچانک سامنے پا کر دونوں دوستوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

”ارے یار.....! تم تو بالکل بھی نہیں بدلے.....“

”اور تم بھی بالکل ویسے ہی ہو جیسے سالوں پہلے تھے۔ مجال ہے کہ شکل صورت ذرا بھی بدلی ہو، اسی لیے تو پہچان لیا۔“ دونوں نے ایک دوسرے کو کہا اور آپس میں بغلگیر ہو گئے۔

”میں ابھی یہاں آیا تھا تا کہ کچھ کھاسکوں پھر اچانک تم پر نظر پڑی اور میں نے تمہیں باہر جاتے دیکھا تو میں تمہارے پیچھے لپکا۔“ طلال نے بتایا۔

”ہاں، میں یہاں جا کر تھا ابھی dues clear کرانے آیا تھا کہ تم نے پکار لیا آؤ کہیں اور چل کر پیٹ پوجا کرتے ہیں.....“ عرشان نے کہا تو طلال چپ چاپ بغیر کوئی سوال کیے اس کے پیچھے باہر چلا آیا۔

”تمہارے پاس گاڑی ہے؟“ عرشان نے پوچھا۔

”نہیں، میں پاکستان مختصر وژٹ پر آیا ہوں تو گاڑی نہیں لی۔ آنے جانے کے لیے رائنڈ بک کر لیتا ہوں.....“ ”چلو پھر تو اچھی بات ہے، میرے ساتھ بائیک پر بیٹھ جاؤ.....“ عرشان نے کہا اور اسے اپنے ساتھ بائیک پر بٹھا کر ایک چھوٹے سے مگر صاف ستھرے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

”باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی پہلے کچھ کھانے کے لیے آرڈر کر دیتے ہیں۔“ عرشان نے کہا اور ویٹر کو بلا کر سینیو کارڈ سے دیکھ کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔

”تم کب سے پاکستان آئے ہوئے ہو.....؟“ عرشان نے اس سے پوچھا۔

”بہی کوئی ہفتہ یا ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا ہے۔“ طلال نے جواب دیا۔

”تم مجھے آنے سے پہلے اگر اطلاع کر دیتے تو میں تمہیں خود انٹرنیوزٹ سے پک کرنے آ جاتا..... مگر تم نے آنے سے قبل تو کیا بلکہ یہاں آ کر بھی رابطہ نہیں کیا..... یعنی اگر ہم آج اتفاقاً نہ ملتے تو پھر ملاقات ہی نہ ہو پاتی.....“ عرشان نے اس سے شکوہ کیا۔

”ایسا نہیں ہے دوست.....! میں نے بار بار تمہارے نمبر پر کانٹیکٹ کرنے کی کوشش کی مگر نمبر ناٹ ریسپونڈنگ تھا۔ شاید تمہارا نمبر تبدیل ہو چکا ہے۔“ طلال نے کہا تو عرشان شرمندگی سے مسکرا دیا۔

”اوہ..... ہاں سوری..... میرا موبائل نمبر واقعی تبدیل ہو چکا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ غم روزگار میں الجھ کر میں اپنے نئے نمبر سے تمہیں کانٹیکٹ ہی نہیں کر سکا۔“ عرشان نے افسردگی سے سر ہلا کر معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں مگر صرف تمہارا شکوہ مٹانے کے لیے بتا رہا ہوں کہ میں دوبار تمہارے گھر بھی جا چکا ہوں مگر متعدد بار ڈور بیل دینے کے باوجود کوئی بھی باہر نہیں آیا تو میں دیر تک دروازے پر کھڑے رہنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔“ طلال کے بتانے پر عرشان ایک بار پھر شرمندہ ہو گیا۔

”اوہ! ریلی سوری! واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... ممانے مجھے کئی بار یاد کرایا بھی کہ ہمارے مین گیٹ کی گھنٹی خراب ہے مگر میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے اب تک گھنٹی ٹھیک نہیں کرا سکا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”سوری میرے بھائی! میں تمہیں ہی الزام دیے جا رہا ہوں جبکہ روابط بحال نہ ہونے میں غلطی تو ہر بار سراسر میری اپنی ہی نکلی.....“ عرشان شرمندہ سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

”کوئی بات نہیں یار..... گلے شکوے بھی تو اپنوں سے ہی کیے جاتے ہیں..... مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے مجھ سے گلہ کیا۔“

”شکریہ طلال! اچھا باتیں تو چلتی رہیں گی، کھانا آگیا ہے تو ساتھ میں کھانا بھی کھا لیتے ہیں ورنہ محبوب کے رویتے کی طرح سرد ہو جائے گا۔“ عرشان نے چکن کڑا ہی طلال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے کہ محبوب بلکہ محبوبہ کے سرد رویتے کا تلخ تجربہ تم بھی حاصل کر چکے ہو۔“ طلال نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو عرشان بھی ہنس پڑا۔

”تم بھی“ سے مراد یعنی کہ تم بھی؟“

”ہاں..... ایسے ناخوشگوار تجربات تو شاید ہر حساس انسان کی زندگی کا حصہ ہوا کرتے ہیں.....“ طلال نے باربی کیو کی بوٹی کاٹنے میں پھنساتے ہوئے جواب دیا۔ جواباً عرشان سر ہلا کر رہ گیا تھا بس۔

”انکل کی ڈیڑھ گھنٹہ کا سب کچھ بہت افسوس ہوا..... ان کے بعد گھربار کی ساری ذمے داری تمہارے کندھوں پر آگئی ہوگی تو گھر اور بزنس سب ٹھیک سے منبج ہو رہا ہے.....“ طلال نے پوچھا تو جواباً عرشان نے اپنے سارے حالات کہہ سنائے، وہ بڑے غور سے چپ چاپ اس کی بات سنتا رہا اور کچھ سوچتا رہا۔ اپنے حالات سنانے کے بعد عرشان نے طلال سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کینیڈا سے ہوئے منیجمنٹ کے مختلف کورسز اور بزنس ایڈمنسٹریشن میں پچھلے ریکارڈز کی ڈگری لینے کے بعد وہاں کے مشہور و معروف ریسٹورنٹ کی چین میں بطور سینئر مینجر کام کرتا رہا اور پھر پیسے جمع کر کے اس نے اپنا گروسری اسٹوری بنایا اور پھر وہاں سے کما کر اپنا ایک ریسٹورنٹ بھی کھولا، اس کا ریسٹورنٹ اپنے کھانوں اور میزبانی کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ اس نے مختلف جگہوں پر فرنیچر اور پین کیں۔ اور اب اپنے والدین کے مشورے پر وہ اپنے ملک میں بھی اسی طرز کا ایک ریسٹورنٹ کھولنا چاہتا ہے بلکہ اپنے کینیڈا والے ریسٹورنٹ کی ہی ایک برانچ بنانا چاہتا ہے اور اسی مقصد کے لیے وہ پاکستان آیا ہے۔

”یعنی تم پاکستان شفٹ ہونا چاہتے ہو.....؟“ عرشان نے پوچھا۔

”ہاں کہہ سکتے ہو کیونکہ میرے پیرنٹس اپنی باقی کی عمر اپنے وطن میں اپنے رشتے داروں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اب وہاں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں کیونکہ بڑے بھائی ایک ڈیڑھ لڑکی سے شادی کر کے فرانس شفٹ ہو گئے ہیں۔ بہن کی شادی بھی وہیں کینیڈا میں مقیم پاکستانی فیملی میں ہو گئی ہے۔ رہا میں تو میری بزنس کی مصروفیات ایسی ہیں کہ میں زیادہ وقت گھر سے باہر ہی ہوتا ہوں..... میرے والد بزنس میں میرے ساتھ ہیلپ کراتے ہیں تو امی گھر پر بالکل اکیلی ہوتی ہیں اور وہ تنہائی سے پریشان ہوتی ہیں۔ ویسے بھی وہ آرٹھرائٹس پیشہ ہیں تو ان کی سرگرمیاں بہت محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور وہ جلد گھبرا جاتی ہیں۔“ طلال نے بتایا۔

”تو تم شادی کر لو تا کہ آٹھ تنہا نہ رہیں اس طرح تمہیں بھی بے فکری ہوگی۔“

طلال نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ کوئی حل نہیں ہے، اول تو وہاں کبائٹڈ فیملی سسٹم کا کوئی تصور نہیں، اگر ایسا ممکن بھی ہو جائے تو وہاں کی لڑکیاں خود بھی گھر رہنے کے بجائے باہر کام کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں تاکہ خود مختار رہ سکیں۔“ طلال نے کہا۔

ماہنامہ پاکیزہ • مارچ 2024ء

”وہاں کسی پاکستانی فیملی کی کوئی لڑکی دیکھ لو.....“ عریشان نے مشورہ دیا۔

”اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ مغربی ممالک میں رہنے والی لڑکیاں چاہے پاکستان ہی کی کیوں نہ ہوں مگر ان کی سوچ، رہن سہن، طرز زندگی اور سوچ یہاں کے ماحول سے مطابقت رکھتی ہے۔“ طلال کی بات پر عریشان نے تائید میں سر ہلایا۔

”ہاں یہ بات تو ہے بلکہ اب تو پاکستان کی لڑکیاں بھی پوری پاکستانی نہیں رہیں، ان کی سوچ بھی کافی بدل چکی ہے، وہ بھی مغربی تہذیب اور وہاں کی عورت کی آزادی و خود مختاری سے بے حد متاثر ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ بات سب لڑکیوں پر لاگو نہیں ہوتی۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ یہاں بزنس سیٹ کرنے والا آئیڈیا کہاں تک پہنچا؟“ عریشان کے سوال پر جواباً طلال اسے ساری تفصیل بتانے لگا کہ ”ریسٹورنٹ کے لیے بلڈنگ کرایے پر لے لی ہے..... اور اس کی تزئین و آرائش کا کام آخری مراحل میں ہے اور ان دنوں ریسٹورنٹ کے لیے تجربے کار محنتی اسٹاف ہائر کرنے میں مصروف ہوں اور اسی لیے روزانہ امیدواروں کے انٹرویوز کرتا ہوں۔ باقی اسٹاف کی تقریباً سلیکشن ہو چکی ہے مگر کوئی تجربے کار اور قابل اعتماد منیجر ابھی تک نہیں ملا..... ایک منٹ.....“ بات کرتے ہوئے طلال کچھ چونکا، پل بھر کور کا اور پھر پُر خیال نظروں سے عریشان کی طرف دیکھنے لگا..... پھر چٹکی بجا کر بولا۔

”مل گیا..... منیجر بھی مل گیا۔“

عریشان حیران ہو کر طلال کو دیکھنے لگا۔

”تم نے ابھی بتایا تھا کہ تم نے اسی ریسٹورنٹ میں کام کیا جہاں ہم ابھی ملے تھے۔ یعنی کہ تمہیں معلوم ہے کہ ایک اچھے ریسٹورنٹ کو کس طرح سے چلا جاتا ہے اور اس کی مینجمنٹ کیا ہوتی ہے اور معاملات کو کس طرح ہینڈل کیا جاتا ہے۔“

”ہاں مگر میں تو..... میں تو وہاں بہت معمولی جاب کرتا تھا۔“ عریشان نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”کوئی بات نہیں..... وہ جاب تمہاری مجبوری تھی تمہاری تعلیم اور قابلیت کے لحاظ سے تمہاری چوائس نہیں تھی۔ مگر یہ اچھا ہوا کہ تمہیں ایک ریسٹورنٹ میں کام کرنے کا تجربہ حاصل ہو گیا اور تمہارا یہ تجربہ میرے کام آئے گا۔“

”مگر.....“ عریشان نے کچھ کہنا چاہا..... مگر طلال نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع کر دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

”مینجمنٹ کا کام تمہارے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہوگا، تم تعلیم یافتہ، انگریزی بول چال کے ماہر محنتی اور قابل اعتماد ہو، مجھے لگتا ہے کہ تم اس جاب کے لیے سب سے زیادہ حقدار اور موزوں ہو۔ تو اگلے ہفتے سے تم ریسٹورنٹ میں

بنے، اپنے آفس میں بیٹھو گے، باقی میں ابھی ایک ماہ تک ادھر ہی ہوں تو ان شاء اللہ تمہیں ساری ڈیوٹیز سمجھا دوں گا، تنخواہ بہت اچھی ہوگی، سال میں ایک دفعہ بونس بھی ملے گا..... اور تمہارے لیے ایک گاڑی بھی آرینج کر دوں گا.....

بولو منظور ہے؟“ طلال نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کچھ جھجکتے ہوئے عریشان نے بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”تھینک یو یار..... تم نے مجھ پر اعتماد کیا اور اس قابل سمجھا..... میں تمہارے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا اور پوری محنت اور توجہ کے ساتھ تمہارے بزنس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی سعی کروں گا، ان شاء اللہ!“ عریشان کی آنکھوں میں ایک نیا عزم اور نئی چمک تھی۔

”گڈ..... مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مایوس نہیں کرے گا.....“ طلال نے کہا۔

”تم مستقل طور پر پاکستان کب سٹیل ہو گے؟ اور کینیڈا والے بزنس کا کیا کرو گے؟“ عریشان نے پوچھا۔

”نی الحال تو پاکستان شفٹ ہونے کا دار و مدار اس ریسٹورنٹ کی کامیابی کے ساتھ یہاں اشارت ہونے والے کچھ اور پراجیکٹس کی کامیابی پر بھی ہے..... اگر سب ٹھیک رہا تو پھر پاکستان شفٹ ہو جاؤں گا اور کینیڈا کا بزنس اپنا لیمن اور بہنوئی کی مگرانی میں دے دوں گا..... وہاں کے پراجیکٹس وہ دیکھیں گے۔ میں خود بھی چکر لگاتا

زہوں گا..... کبھی یہاں اور کبھی وہاں..... اور وہاں جو بھی سالانہ منافع ہو گا وہ ہم اخراجات نکال کر آپس میں تقسیم کر لیا کریں گے اور اگر میں پاکستان شفٹ نہ ہوا تو یہاں سارے بزنس کی دیکھ بھال تم کیا کرو گے..... میں بس کبھی کبھار چکر لگایا کروں گا..... بہر حال مختصر یہ کہ میں یہاں کے بزنس کو اشارٹ میں کچھ زیادہ ٹائم دوں گا مگر مستقل پاکستان شفٹ ہونے میں سال یا اس سے زیادہ کا عرصہ لگ سکتا ہے.....“ طلال نے تفصیل سے بتایا۔

”چلو اللہ پاک خیر رکھے، مولا کرم فرمائے تو آسانیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ ان شاء اللہ.....“ عریشان نے کہا اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ طلال کے اصرار کے باوجود بل عریشان نے ہی پے کیا اور دونوں دوست اٹھ... کھڑے ہوئے۔

طلال ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ عریشان نے اپنی بایک پر طلال کو اس کے گیسٹ ہاؤس کے سامنے اتارا..... اور شام کو دوبارہ ملنے کا ٹائم طے کرتے ہوئے واپس جانے کے لیے بایک کو کلک مارنے لگا تو طلال نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا بیٹا نکالا اور اس میں سے چند پانچ ہزار اور کچھ ہزار والے نوٹ نکالے اور حیران و پریشان کھڑے عریشان کے ہاتھ میں تھما دیے۔

”یہ رکھ لو میرے دوست.....! یہ تمہاری تنخواہ کا ایڈوانس ہے..... کل سے ریسٹورنٹ چلے آنا اور وہاں ہونے والے کاموں میں بھی میرا ہاتھ بٹانا..... سمجھو کل سے تمہاری جاب اشارٹ ہے۔“ عریشان کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جزاک اللہ خیر..... کہہ کر نوٹ لے لیے اور گئے بغیر اپنے والٹ میں رکھ لیے۔

”آئی کو میرا سلام دینا۔“ طلال نے کہا۔

”ضرور دے دوں گا بلکہ فون پر تمہاری بات بھی کرادوں گا.....“ عریشان نے کہا پھر اپنا ہیلمٹ نیچے کرتے ہوئے طلال کو بائے کہا اور موٹر بایک اشارٹ کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

ازنا کو بڑا مان تھا کہ وہ نخرے دکھائے گی اور روٹھنے کا ڈراما کرے گی تو عریشان فوراً پریشان ہو جائے گا اور دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اسے منانے کی تک و دو میں لگ جائے گا مگر جب اتنے دن گزرنے کے باوجود بھی ایسا کچھ نہیں ہوا تو وہ خود پریشان ہو گئی اور عریشان کی اس بے حسی اور کٹھور پن کی ذمے دار مرحا کو ہی سمجھنے لگی۔

”تم اس قدر بے وفا نکلو گے اور اتنی جلدی بدل جاؤ گے اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جانتی ہوں کہ مرحا کی من موہنی اور معصوم صورت کا جادو تم پر پوری طرح سے چل چکا ہے۔ میں، میں چھوڑ دوں گی نہیں اس مرحا کی بچی کو.....“

چڑیل کہیں کی۔ مجھ سے میرا پیار چھین لیا۔ میں صورت بگاڑ دوں گی مرحا کی۔“ ازنا کو عریشان کی بے وفائی پر رونا جبکہ مرحا پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”مگر مرحا کو تو تمہاری محبت کا علم ہی نہیں ہے۔ وہ تو اس وقت گناہ گار ہوتی جب حقیقت کا علم ہونے کے باوجود تمہاری محبت پر ڈاکا ڈالتی جبکہ اسے تو تمہارے اور عریشان کے پیار سے متعلق کسی بات کا بھی کوئی علم نہیں ہے۔ پھر وہ کیسے قصور وار ٹھہری۔“ ازنا کے ضمیر سے اک آواز ابھری۔

”پھر تو سارا قصور عریشان کا ہوتا ہے..... وہ تو میرے دل میں رہتا تھا اور میرے دل کی دنیا کی ہر بات سے باخبر تھا..... پھر وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟“ ازنا نے سوچا۔

”کیا خبر کہ مرحا اور عریشان دونوں ہی بے قصور ہوں اور میں ہی کچھ زیادہ حساس ہو کر سوچ رہی ہوں اور بلاوجہ اپنے اندر شک کو پنپنے دے رہی ہوں..... مگر عریشان کے لہجے میں مرحا کے لیے جو محبت اور ہمدردی میں نے محسوس کی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ عریشان کے دل میں مرحا کے لیے کچھ نہ کچھ ہے ضرور..... ورنہ کسی غام لڑکی کی وجہ

سے عرشان مجھ سے یوں ناراض ہو ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”وہ کوئی اور نہیں سگی بہن ہے تمہاری.....“ دل نے ملامت کی۔

”تو پھر کیا کروں.....؟ اپنی غلطی مان کر عرشان سے سوری کر لوں؟ چلو کر بھی لیتی ہوں سوری مگر اس طرح تو اسے عادت ہی پڑ جائے گی۔ زندگی میں جب بھی ذرا سی کھٹ پلٹ ہوئی تو وہ یہی چاہے گا کہ میں ہی معافی مانگوں اور سوری کہوں..... اونہہ..... سوری کہتی ہے میری جوتی..... میں اسے یاد کر رہی ہوں تو وہ مجھے یاد کیوں نہیں کرتا، وہ کر لے ناں مجھ سے سوری..... ناول کی کہانیوں اور فلموں میں تو یہی ہوتا ہے کہ غلطی چاہے ہیروئن کی ہی کیوں نہ ہو، مگر اسے مانتا تو ہمیشہ ہیرو ہی ہے۔ اور عرشان تو ہمیں روکے بجائے زیر و نکلا۔ کاش اسے دینے کے بجائے میں کسی پتھر کو دل دے دیتی۔“

ازنا کا دل بھر آیا تو اس کی پلکیں غم ہونے لگیں جنہیں چھپانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ کبل میں چھپا لیا تھا۔

☆☆☆

بدالدین کی بارات حاجرہ کے گھر جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی تھی۔

اس بارات میں صرف ان کی بہنوں کی فیملیز، ان کی بیٹیاں اور چند قریبی دوست اپنی بیگمات کے ساتھ شامل تھے۔ بدالدین کی بیٹیوں میں سے صرف ان کی دو بیٹیاں زونا نشہ، اور ازنا ہی بارات کے ساتھ جا رہی تھیں۔ جبکہ مرحانے حسب توقع ماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس شادی میں شامل ہونے سے منع کر دیا تھا۔ فالسی شرارے اور شارٹ فرائک کے ساتھ گولڈن نفیس جیولری نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ بلاشبہ اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ جو بھی دیکھتا، دل تھام کر رہ جاتا۔

عارف نے بھی زونا نشہ کو دیکھا تو دل ہی دل میں سراپے بنانہ رہ سکا..... اور اس سے پہلے کہ زونا نشہ آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتی اس نے فوراً نظریں ہٹا لی تھیں۔

”اگر میرے دل و دماغ پر مرحا کی حکمرانی نہ ہوتی امی کے اس انتخاب کو میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔“ عارف نے دل میں سوچا اور دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتا زونا نشہ کی جانب بڑھا۔

دوسری طرف زونا نشہ نے بھی عارف کو اپنی جانب آتے دیکھ لیا تھا اور اس کا دل سینے میں ایسے دھڑک رہا تھا گویا سینہ توڑ کر ابھی عارف کے قدموں میں جا گرے گا..... اپنی بے قابو کیفیت کو نادرل کرنے کے لیے زونا نشہ نے اپنی نظریں جھکا لیں اور اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی۔ مگر اس کوشش میں اس کے رخسار دھک اٹھے تھے۔

یہ چند قدم کا فاصلہ جیسے صدیوں پر محیط ہو چلا تھا۔

بالآخر عارف اس کے قریب پہنچ گیا۔

چند لمحے نزدیک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ اس کی جانب اتنا قریب چلا آیا کہ عارف کی گرم سانسیں زونا نشہ کے چہرے سے ٹکرانے لگیں۔

زونا نشہ نے گھبرا کر اپنی پلکیں جھکا لی تھیں۔

”آئی ایم سوری زونا نشہ، پلیز forgive me“ زونا نشہ کے کانوں سے عارف کی سرگوشی ٹکرائی تو اس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ مگر عارف اتنی سی دیر میں یہ چند الفاظ ادا کر کے رخ موڑ کر تیزی سے دوسری جانب جاتا دکھائی دیا۔

”یا اللہ..... یہ کوئی خواب تھا یا حقیقت.....“ زونا نشہ کو ابھی تک اپنے قریب عارف کے لگائے گئے پرفیوم کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔

”کیا عارف مجھ سے سوری کر رہے تھے؟“ اس نے خود کلامی کی۔

”شاید وہ جانتے تھے کہ پرسوں شام ہماری منگنی کی تقریب ہونا بھی مگر ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہماری منگنی

کی یہ تقریب ملتوی ہوگئی اور عارف سمجھے کہ میں شاید اس بات پر ان سے خفا ہوں گی۔ ہاں ایسا ضرور تھا کہ میں بہت مایوس اور دکھی تھی اپنی ممکنہ ملتوی ہونے پر..... مگر ظاہر ہے کہ عارف نے ایسا جان بوجھ کر تو نہیں کیا ہوگا..... پھپھو بتا رہی تھیں کہ ان کے دوست کے فادر کی طبیعت بہت خراب تھی اور اپنے دوست کو حوصلہ دینے کی خاطر عارف کو اچانک پشاور جانا پڑا تھا۔ اور پھر اپنے دوست کی فادر کی ڈیڑھ کی وجہ سے وہیں چند دن رکنا پڑا تھا تو خیر ممکنہ تو پھر بھی ہو جائے گی مگر کتنی دکھ کی بات ہے کہ عارف کے دوست کے فادر تو اب دنیا میں لوٹ کر نہیں آسکتے، عارف نے اسے کڑے وقت میں اپنے دوست کی ہمت بندھائی اور اسے حوصلہ دیا تو یہ تو بہت بڑی نیکی کی ہے انہوں نے۔ مجھے فخر ہے عارف پر..... اور میں بھلا عارف سے کیوں خفا ہوتی بھلا..... میں تو عارف سے کبھی روٹھ ہی نہیں سکتی۔ پھر بھلا انہیں معذرت کی کیا ضرورت تھی۔“ زونا نشہ اپنی سوچوں میں گہری کھڑی تھی کہ ازنا نے آکر اس کا بازو دھلایا۔

”اب چلو بھی زونی آئی! کیا یہیں کھڑی رہو گی..... وہاں باہر سب گاڑیوں میں بیٹھ رہے ہیں اور پاپا ہم دونوں کو بلارہے ہیں۔“

”آں..... ہاں..... ہاں..... چلو.....“ زونا نشہ، ازنا کے ساتھ باہر چلی آئی۔

عارف پھپھو نے دیکھا انہیں اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

”تم دونوں میں سے کوئی ایک میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور ایک عاتکہ کی گاڑی میں چلی جاؤ.....“ انہوں نے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ ٹھہروں گی پھپھو.....“ زونا نشہ نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر کہا تھا۔

”ٹھیک ہے تم میری گاڑی میں آ جاؤ.....“ عارف پھپھو نے کہا تو وہ فوراً ان کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم ادھر آ جاؤ ازنا.....“ عاتکہ پھپھو نے کہا تو ازنا مرے، مرے قدموں سے ان کے پیچھے چل پڑی۔

”ایک منٹ ٹھہرو ازنا.....!“ عارف پھپھو نے اسے پکارا۔

”جی پھپھو.....“ ازنا نے بیزاری سے پھپھو کی طرف دیکھا۔

پھپھو نے قریب آ کر فرط محبت سے ازنا کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

”تم پچھلے کئی دنوں سے مجھے بہت ڈاؤن لگ رہی ہو اور آج بھی بہت اداس دکھائی دے رہی ہو..... حوصلے

سے کام لو میری بچی..... رفتہ، رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سب اللہ کے فیصلے ہیں، وہی سارے معاملات میں بہتر کو بہترین میں بدلنے پر قادر ہے۔ تم اس کی ذات پر بھروسہ رکھو.....“

پھپھو، ازنا کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سمجھ رہی تھیں کہ اسے اپنے پاپا کی دوسری شادی کا دکھ ہے اور وہ

سو تیلی ماں کے حوالے سے سنی سنائی کہانیوں کو سوچ کر اپنے مستقبل سے خوفزدہ ہے اور اسی لیے چپ، چپ اور

ڈری سبھی سی دکھائی دے رہی ہے۔ مگر عارف پھپھو کا اندازہ غلط تھا اور وہ محض پیار میں ایسا سوچ رہی تھیں۔ جبکہ ازنا

ذہنی طور پر حاجرہ کو بطور اپنی ماں نہ سہی مگر پاپا کی دوسری بیوی کے طور پر قبول کر چکی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پاپا

کے نزدیک جو اہمیت اپنی بیٹیوں کی ہے وہ بطور بیوی آنے والی عورت حاجرہ کی نہیں ہو سکتی..... اسی لیے اس معاملے

کی اسے کوئی ٹینشن نہیں تھی..... مگر پھپھو جانے کیا سمجھ رہی تھیں۔ اسی لیے ازنا کو سلی دینے چلی آئی تھیں۔

”جی پھپھو! آپ ہیں ناں ہمارے ساتھ پھر بھلا فکر کی کیا بات۔“ ازنا نے اتنی سعادت مندی سے کہا تھا کہ

پھپھو نہال ہو گئیں۔ اور اسے ایک بار پھر گلے لگا کر پیار کیا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اور پھپھو کے رخسار سے اپنا

رخسار مس کرتے ہوئے ”تھینک یو پھپھو جانی.....“ کہتے ہوئے عاتکہ پھپھو کی گاڑی کی جانب بڑھ گئی تھی۔

گاڑیوں میں سب کے بیٹھنے کے بعد یہ چھوٹا سا قافلہ بارات کی صورت حاجرہ کے گھر والوں کے.... دیے

ہوئے ایڈریس کے مطابق ”ڈولی باجا“ نامی شادی ہال کی جانب روانہ ہو گیا۔

(جاری ہے)